قرآن کریم اور روحانیت

پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی

روحانیت اور تعلق باللہ

اللہ کی رضا کا حصول روحانیت کا سب سے بلند مرتبہ ہے۔ اس مرتبے کو حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے مضبوط قلبی تعلق مطلوب ہے اور یہی عبادت کی روح ہے۔ جبریل امینؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لے گئے، آنجنابؐ نے پوچھا کہ احسان کیا ہے؟ تو انھوں نے فرمایا:

اَنْ تَعْبُدَ اللہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ (الجامع الصحیح مسلم) اللہ کی عبادت اس طرح کیجیے کہ گویا آپ اللہ کو دیکھ رہے ہیں۔ اگر یہ کیفیت پیدا نہ ہو تو اتنی کیفیت پیدا کیجیے کہ خدا آپ کو دیکھ رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے رُوبرو ہونا بندگی کا کمال ہے، مگر اس کیفیت کا دل میں پیدا ہونا پاکیزگیِ قلب اور انابت کی گہرائی چاہتا ہے۔ خدا کو دیکھنے کی کیفیت پیدا کرنے کے لیے اعضا و جوارح کی تربیت کے ساتھ نفس کا تزکیہ اور دل کی خشیت ضروری ہے۔ اس سے نیچے کی منزل یہ ہے کہ یہ کیفیت پیدا ہوجائے کہ خدا ہم کو دیکھ رہا ہے۔ یہ تصور بھی انسان کے دل کو بدل دیتا ہے اور نفس کے شرور و فتن کو زائل کر دیتا ہے۔ یہی اخلاص ہے۔

اخلاص

ایک مزدور کو اگر یہ معلوم ہو کہ اس کا مالک موقعے پر موجود نہیں ہے تو وہ کام میں سستی کرتا ہے، وقت ضائع کرتا ہے اور کام کرتا بھی ہے تو بے دلی سے کرتا ہے، کام کا مطلوبہ نتیجہ نہیں نکلتا۔ لیکن اگر کسی مزدور کو یہ معلوم ہو کہ اس کا مالک اس کے سامنے کھڑا ہے تو کام میں چستی دکھاتا ہے،

جی لگا کر کام کرتا ہے اور وقت گذاری سے پرہیز کرتا ہے۔ اسی طرح بندے کو یہ احساس ہو جائے کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے تو اس کے دل کی کیفیت اور جسمانی عمل کی حالت بدل جاتی ہے۔ اس کی عبادت میں یکسوئی پیدا ہو جاتی ہے اور اسی سے اخلاص پیدا ہوتا ہے۔

عبادت سے مراد صرف نماز نہیں ہے بلکہ ہر قسم کی عبادت ہے اور ہر عبادت اپنی قبولیت کے لیے اخلاص چاہتی ہے۔ اللہ کی رضا جوئی، بے لوث بندگی، اللہ سے خوف و امید کے ساتھ طلب، قبولیت کے دروازے کھولتی ہے۔ کسی عمل میں نام و نمود اور ریاکاری شامل ہو جاتی ہے تو اللہ اپنی رحمت سے محروم کر دیتا ہے اور وہ عمل مقبول نہیں ہوتا۔ اسی لیے اللہ کا حکم ہے:

فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ؕ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ؕ (الزمر ۳۹:۲-۳)
اللہ کی عبادت کرو اس کے لیے دین کو خالص کر کے، آگاہ رہو کہ دین خالص اللہ کے لیے ہے۔

صدقہ، زکوٰۃ، خیرات، غربا پروری اور ناداروں کی حاجت روائی سب انسانیت کی بھلائی اور روحانیت کی ترقی کا عمل ہے، مگر اس کی شرط بھی اللہ کی رضا جوئی ہے۔ ارشاد ہے:

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ۝ (الدھر ۷۶:۸-۱۰) اور اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم کو اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور ان سے کہتے ہیں کہ) ہم تمھیں صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں، ہم تم سے نہ تو کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ۔ ہمیں تو اپنے رب سے اس دن کے عذاب کا خوف ہے جو سخت مصیبت کا انتہائی طویل دن ہوگا۔

اللہ کا ذکر دل کی زندگی ہے

اخلاص کے لیے اللہ کے حاضر و ناظر ہونے کا احساس ضروری ہے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی یاد، اس کا استحضار اور اس کا ذکر کرتے رہنا روحانیت کی شاہِ کلید ہے۔ چنانچہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝

وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿١٧﴾ اِنَّ هٰذَا لَفِى الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿١٨﴾ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ﴿١٩﴾ (الاعلیٰ ۸۷: ۱۴-۱۹) بے شک وہ شخص کامیاب ہو گیا جس نے اپنا تزکیہ کیا، اپنے رب کے اسم گرامی کا ذکر کیا اور نماز ادا کی، بلکہ تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، جب کہ آخرت باقی رہنے والی اور بہتر ہے۔ یہ بات گذشتہ آسمانی صحیفوں میں بھی موجود ہے، صحیفہ ابراہیمؑ اور صحیفہ موسیٰؑ میں۔

اللہ کے ذکر سے روحانیت جلا پاتی ہے اور روحانی ترقی نصیب ہوتی ہے۔ یہ بات پہلے بھی تمام آسمانی صحیفوں میں بیان کی گئی ہے اور اس قرآن میں بھی اس کی تائید کی گئی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ﴿٤١﴾ وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿٤٢﴾ (الاحزاب ۳۳: ۴۱-۴۲) اے ایمان والو! اللہ کا کثرت سے ذکر کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرو۔

دل میں اللہ کی یاد اور زبان سے اس کا ذکر قلبِ انسانی کو تر و تازہ رکھتا ہے۔ ذکرِ الٰہی روح کی غذا ہے۔ جس دل میں خدا کی یاد ہو وہ زندہ ہے اور جو دل یادِ خدا سے غافل ہو وہ مُردہ ہے۔ قرآن نے یہ راز اس طرح عیاں کیا ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴿٢٨﴾ (الرعد ۱۳: ۲۸) جو لوگ ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کے ذکر سے طمانیت پاتے ہیں۔ آگاہ ہو کہ اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو تسکین ملتی ہے۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس روحانی نکتے کی مزید وضاحت اس طرح فرمائی ہے:

مَثَلُ الَّذِيْ يَذْكُرُ رَبَّهٗ وَالَّذِيْ لَا يَذْكُرُهٗ مَثَلُ الْحَيِّ وَالْمَيِّتِ (الجامع الصحیح بخاری) اس شخص کی مثال جو خدا کو یاد کرتا ہے زندہ کی ہے، اور اس شخص کی مثال جو خدا کو یاد نہیں کرتا مُردہ کی ہے۔

قرآن کی نظر میں ہر سانس لینے والا انسان زندہ نہیں ہے بلکہ ذکر کرنے والا انسان زندہ ہے۔ جسمانی زندگی کھانے سے اور سانس لینے سے قائم رہ سکتی ہے مگر روحانی زندگی یادِ خدا کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی۔ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا۔ اسلام کے احکام

تو بہت سے ہیں مجھے کوئی ایسی بات بتا دیجیے جسے میں لازم پکڑلوں۔ رسولؐ پاک نے ارشاد فرمایا:

لَا یَزَالُ لِسَانُكَ رَطْبًا مِنْ ذِکْرِ اللّٰہِ (سنن ترمذی) تمھاری زبان ہمیشہ اللہ کے ذکر سے تروتازہ رہے۔

اللہ کے ذکر کی ایک تو عمومی شکل ہے کہ اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، صبح وشام اللہ کے نام کا ورد کیجیے، اس کی تسبیح کیجیے، جس کا حکم قرآن پاک میں اس طرح دیا گیا ہے:

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ۝۲۰۵ (الاعراف ۷:۲۰۵) اپنے جی میں اپنے رب کا ذکر کرو، عاجزی اور خاموشی اور کم آواز سے صبح وشام اور غافلوں میں نہ ہو جاؤ۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے:

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ۝۱۷ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ۝۱۸ (الروم ۳۰:۱۷-۱۸) اللہ سزا وارِ تسبیح ہے، جب تمھاری شام ہو اور جب تمھاری صبح ہو، اسی کے لیے آسمان وزمین میں حمد ہے، رات میں بھی اور جب تمھارا دن ہو۔

اللہ کا ذکر انسان کے میل کچیل کو دھو دیتا ہے، دل کی سختی کو دور کر کے خشیت وانابت پیدا کر دیتا ہے، اور اسے بارگاہِ رب العزت میں نذر کے قابل بنا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ۝۲ (الانفال ۸:۲) سچے اہل دل تو وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر اعتماد رکھتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمومی ذکر کے لیے بہت سے وظائف کی تعلیم فرمائی ہے۔ اس میں سب سے آسان اور مقبول ذکر ہے: سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

كَلِمَتَانِ خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ، ثَقِيْلَتَانِ فِي الْمِيْزَانِ، حَبِيْبَتَانِ اِلَى الرَّحْمٰنِ

سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ (الجامع الصحیح بخاری) دو جملے رحمن کو بہت بہت پسند ہیں، وہ جملے زبان پر ہلکے اور میزان میں بھاری اور رحمن کو محبوب ہیں۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ۔

اللہ کے ذکر کی دوسری شکل خاص اور ضابطۂ بند ہے اور وہ نماز ہے جو پانچ وقتوں میں فرض ہے اور بقیہ اوقات میں نفل ہے۔ نماز کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ (طٰہٰ ۲۰:۱۴) نماز قائم کر میری یاد کے لیے۔

ذکر کی منظم اور مکمل صورت نماز ہے۔ اسی لیے نماز کو مومن کی معراج فرمایا گیا ہے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِنَّ اَحَدَكُمْ اِذَا صَلّٰى يُنَاجِيْ رَبَّهٗ ''جب تم میں سے کوئی نماز ادا کر رہا ہوتا ہے تو وہ اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے''۔

بندہ کا خدا سے، حبیب سے مکالمہ وجد انگیز، روح پرور اور حاصل زندگی ہوتا ہے۔ یہ مقام انسان کو نماز سے حاصل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ (ھود ۱۱:۱۱۴) نماز قائم کرو دن کے کناروں میں اور رات کے حصے میں، بے شک نیکیاں برائیوں کو زائل کر دیتی ہیں، یہ نصیحت ہے ذکر کرنے والوں کے لیے۔

عمومی ذکر کا اعتبار اسی وقت ہوتا ہے جب انسان ذکر خصوصی، یعنی نماز کا اہتمام کرتا ہو۔ جو شخص فرض نمازوں کا پابند نہیں وہ لاکھ ذکر الٰہی کا دعویٰ کرے اس کا دعویٰ معتبر نہیں، کیوں کہ ایمان اور کفر کے درمیان حدِ فاصل نماز ہے۔ جو شخص خدا کا دوست ہونے کا دعویٰ کرتا ہے وہ اس کے آگے سر جھکانے سے اور اس کے حکم کی تعمیل کرنے سے کیسے روگردانی کر سکتا ہے۔

اعمالِ صالحہ

نماز کے علاوہ دوسری تمام عبادات کا اہتمام کرنا، جیسے صدقہ، زکوٰۃ، خیرات، روزہ، حج، جہاد اور ان عبادات کے علاوہ تمام اعمالِ صالحہ کا التزام کرنا روحانیت کے لیے لازم ہے۔ صرف کلمۂ توحید کا اقرار کرنا اور شرک وکفر سے پرہیز کرنا روحانی زندگی کے لیے کافی نہیں ہے، بلکہ نیک

عمل کو زندگی کا طریقہ اور وظیفہ بنا لینا ضروری ہے۔ روحانیت کے لیے اعمال صالحہ کا اہتمام کرنے کی ضرورت اور حکمت کیا ہے؟ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے:

''عیسائیوں میں جیسا کہ پال کے خطوط میں ہے، صرف ایمان پر نجات کا دارومدار ہے، اور بودھ دھرم میں صرف نیکوکاری سے نروان کا درجہ ملتا ہے اور کہیں صرف گیان اور دھیان کو نجات کا راستہ بتایا گیا ہے، مگر پیغمبر اسلام علیہ السلام کے پیغام نے انسانیت کی نجات کا ذریعہ ذہنی (ایمان) اور جسمانی (عمل صالح) کو ملا کر قرار دیا ہے، یعنی پہلی چیز یہ ہے کہ ہم کو اصول کے صحیح ہونے کا یقین ہو، اس کو ایمان کہتے ہیں، پھر یہ کہ ان اصولوں کے مطابق ہمارا عمل درست اور صحیح ہو، یہ عمل صالح ہے۔ ہر قسم کی کامیابیوں کا انحصار انھی دو باتوں پر ہے۔ کوئی مریض صرف اصول طبی کو صحیح ماننے سے بیماریوں سے نجات نہیں پا سکتا، جب تک وہ ان اصولوں کے مطابق عمل بھی نہ کرے۔ اسی طرح صرف اصولِ ایمان کو تسلیم کر لینا انسانی فوز و فلاح کے لیے کافی نہیں ہے جب تک ان اصولوں کے مطابق پورا پورا عمل بھی نہ کیا جائے''۔[٦]

عمل صالح کا اہتمام کرنے سے انسان اللہ کی نظر میں بھی محبوب ہو جاتا ہے اور دوسرے انسان بھی اس سے محبت اور اس کی عزت کرنے لگتے ہیں، یعنی جو اللہ کی بارگاہ میں مقبول ہوتا ہے وہ بندوں کی نظر میں بھی محبوب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿٩٦﴾ (مریم ۱۹:۹۶) جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے عمل صالح کا اہتمام کیا عنقریب رحمٰن ان کو دوست بنائے گا۔

ترکِ معاصی

اعمالِ صالحہ کا فائدہ انسان کو اس وقت ہوتا ہے جب وہ بُرے اعمال، بُرے خیالات اور بُری باتوں سے اجتناب کرے۔ اعمالِ صالحہ روحانی امراض کے لیے دوا ہیں اور بری باتوں سے دُور رہنا پرہیز کے درجے میں ہے۔ جب تک مریض پرہیز نہیں کرتا دوا کارگر نہیں ہوتی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ؕ (الانعام ٦:۱۲۰) ظاہری اور باطنی ہر قسم کی برائی

ترک کردو۔

بُرے اعمال اور برے خیالات کا اثر انسان کے قلب وذہن پر پڑتا ہے اور اسے روحانی کیفیات کا حامل بننے سے روکتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۝۱۴ (المطففین ۸۳:۱۴) ہرگز نہیں، بلکہ ان کے اعمال کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ لگ گیا ہے۔

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر سیاہ نکتہ بن جاتا ہے۔ اگر وہ اس سے توبہ واستغفار کرتا ہے تو وہ سیاہی زائل ہو جاتی ہے، اور اگر وہ پھر گناہ کرتا ہے تو سیاہی زیادہ ہو جاتی ہے۔ یہی وہ زنگ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کیا ہے۔

اس لیے روحانیت کی سب سے پہلی منزل یہ ہے کہ اوصاف رزیلہ انسان کے دل سے نکل جائیں اور دوسری منزل یہ ہے کہ اوصاف حمیدہ کا دل خوگر ہو جائے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے توبہ واستغفار کرنے کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝۳۱ (النور ۲۴:۳۱) اے مومنو! تم سب اللہ سے توبہ کرو تا کہ فلاح پاؤ۔

توبہ و استغفار

انسان سے دانستہ خطائیں سرزد ہوتی ہیں۔ توبہ ان خطاؤں سے معافی کا دروازہ کھولتی ہے اور اللہ کی رحمت کو متوجہ کرتی ہے۔ اللہ کو وہ بندہ پسند ہے جو غلطی کرے تو اللہ سے توبہ واستغفار کرے۔ اللہ تعالیٰ کے حضور حضرت آدمؑ اور ابلیس دونوں سے غلطی سرزد ہوئی۔ حضرت آدمؑ کی غلطی یہ تھی کہ اللہ کے منع کرنے کے باوجود انھوں نے شجرِممنوعہ کا پھل کھا لیا اور ابلیس کی غلطی یہ تھی کہ اللہ کے حکم دینے کے باوجود حضرت آدمؑ کو سجدہ نہ کیا۔ دونوں خطا کار تھے مگر ایک راندۂ دربار ہوا اور دوسرے نے معافی اور محبت پائی، اس لیے کہ دونوں کے رویے میں بڑا فرق تھا۔

پہلا فرق یہ تھا کہ حضرت آدمؑ نے اپنی غلطی کا اقرار کیا مگر ابلیس نے اپنی غلطی کا اقرار نہیں کیا۔ دوسرا فرق یہ تھا کہ حضرت آدمؑ اپنی غلطی پر نادم ہوئے اور ابلیس کو اپنی غلطی پر ندامت نہیں

ہوئی۔ تیسرا فرق یہ تھا کہ حضرت آدمؑ نے اپنی غلطی کو اپنے نفس کی خطا قرار دیا اور ابلیس نے اپنی غلطی کو خدا سے منسوب کیا اور کہا: رَبِّ بِمَآ اَغۡوَيۡتَنِيۡ (الحجر ۱۵:۳۹) ''اے رب تو نے مجھے گمراہ کیا''۔ چوتھا فرق یہ تھا کہ حضرت آدمؑ نے گڑگڑا کر توبہ کی اور کہا:

> رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ اے ہمارے رب ہم نے اپنی جان پر ظلم کیا اور اگر تو ہمیں معاف نہ کرے اور رحم نہ کرے تو ہم خسارے میں مبتلا ہو جائیں گے۔

اور ابلیس توبہ کرنے کے بجائے گناہ پہ قائم رہا۔ ابلیس کا یہ رویہ غلطی پر اصرار اور سرکشی کا تھا۔ حضرت آدمؑ کا رویہ عاجزی کا تھا۔ ابلیس نے استکبار کیا، حضرت آدمؑ نے استغفار کیا۔ اسی فرق نے دونوں کے انجام کو جدا کیا۔ ابلیس ملعون ہوا اور حضرت آدمؑ محبوب ہوئے۔

صبر و توکل کا التزام

روحانی اعمال و وظائف کی پابندی کرنا اور منکرات و خواہشات سے اجتناب کرنا صبر چاہتا ہے۔ اس راہ میں مشکلات و موانعات ہیں، تکالیف اور شدائد ہیں اور ان کو انگیز کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے بندوں کو صبر کی تلقین کی ہے اور صبر ہی پر آخرت کا اجر ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوۡنَ اَجۡرَهُمۡ بِغَيۡرِ حِسَابٍ (الزمر ۳۹:۱۰) صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر دیا جائے گا۔

صبر انسان کو حرص و ہوس سے بچاتا ہے اور گناہ اور شہوت سے بھی دُور رکھتا ہے۔ صبر وقتی بھی ہوتا ہے اور دائمی بھی۔ روحانی زندگی دائمی زندگی ہے۔ اس لیے صبر کو ہمیشہ اختیار کرنا مومن کی شان ہے۔ اس کے لیے نمونہ انبیا علیہم السلام ہیں خصوصاً محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ ہے جس کے اتباع کا حکم قرآن پاک میں اس طرح دیا گیا ہے:

> فَاصۡبِرۡ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الۡعَزۡمِ مِنَ الرُّسُلِ (الاحقاف ۴۶:۳۵) جس طرح عالی ہمت رسولوںؑ نے صبر کیا اس طرح صبر کرو۔

حضرت ابوسعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ انصار کے کچھ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے

پاس آئے اور سوال کیا، رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو عطا فرمایا۔ انھوں نے پھر سوال کیا، رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر عطا فرمایا۔ یہاں تک کہ آپؐ کے پاس جو کچھ تھا وہ ختم ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سارا مال ان کو دینے کے بعد فرمایا کہ میرے پاس جو مال آتا ہے وہ تم سے بچا کر نہیں رکھتا۔ اب جو شخص اللہ سے عفت چاہتا ہے اللہ اس کو عفیف بنا دیتا ہے اور جو استغناء طلب کرتا ہے اس کو مستغنی بنا دیتا ہے، اور جو کوشش کر کے صبر اختیار کرتا ہے اللہ اس کو صابر بنا دیتا ہے اور کسی شخص کو صبر سے بہتر وسیع عطیہ نہیں دیا گیا۔ (الجامع الصحیح بخاری)

انسانی اذیتوں، آسمانی بلاؤں اور دنیوی مشکلات و مصائب پر صبر کرنے کے ساتھ ضروری ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرے۔ اسباب و وسائل سے بھی کام لے مگر ان پر بھروسا نہ کرے، بلکہ بھروسا صرف اللہ پر کرے، کیوں کہ مشکلات اللہ کی طرف سے آتی ہیں، وسائل واسباب کو اللہ پیدا کرنے والا ہے اور وہی وسائل سے ماورا ہو کر انسان کی مدد کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> اِنَّ اللّٰہَ بَالِغُ اَمْرِہٖ ط قَدْ جَعَلَ اللّٰہُ لِکُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا ۳ (الطلاق ۶۵:۳) جو شخص اللہ پر بھروسا کرے گا تو اللہ اس کے لیے کافی ہے، اللہ اپنا کام انجام تک پہنچاتا ہے، ہر چیز کے لیے اس نے پیمانہ مقرر کر رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرب رسولوں کو توکل کی تفہیم اس طرح دی ہے:

> وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَکَّلَ عَلَی اللّٰہِ وَقَدْ ھَدٰىنَا سُبُلَنَا ط وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰی مَآ اٰذَیْتُمُوْنَا ط وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُتَوَکِّلُوْنَ ۱۲ (ابراہیم ۱۴:۱۲) اور ہمیں کیا ہو گیا ہے کہ ہم اللہ پر بھروسا نہ کریں، جب کہ اس نے ہمیں ہماری راہیں دکھائیں، اور ہم تمھاری اذیتوں پر صبر کریں گے اور بھروسا کرنے والوں کو اللہ ہی پر بھروسا کرنا چاہیے۔

مال و دولت روحانیت کے منافی نہیں

فقر و درویشی روحانیت کے لیے موزوں ہے مگر لازمی نہیں ہے۔ مال و دولت روحانیت کے منافی نہیں ہے بشرطیکہ حلال طریقے سے کمایا جائے اور اللہ اور بندوں کے حقوق ادا کیے جائیں۔

اگر حقوق اللہ ادا کرتے ہوئے مال و دولت حاصل کیا جائے تو یہ مذموم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ (النور ۲۴:۳۷) یہ وہ لوگ ہیں جن کو تجارت اور بیع اللہ کے ذکر سے اور نماز قائم کرنے سے اور زکوٰۃ دینے سے نہیں روکتی۔

غریبوں، ناداروں اور محتاجوں پر مال و دولت خرچ کرنا روحانیت کا طریقہ ہے اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب انسان کے پاس مال و دولت ہو۔ مال داروں پر اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ فرض کی ہے اور ان کو صدقات کی تعلیم دی ہے۔ ارشاد فرمایا:

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾ (البقرہ ۲:۲۷۴) جو لوگ اپنا مال خرچ کرتے ہیں رات میں اور دن میں، پوشیدہ اور ظاہری طور پر، ان کے لیے ان کا اجر ہے، ان کے رب کے پاس، نہ ان کو کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا تزکیہ نفس کا بڑا ذریعہ ہے۔ غریبوں پر مال خرچ کرنے سے دولت بھی پاک ہوتی ہے اور انسان کا نفس بھی پاک ہوتا ہے۔ صحابہ کرامؓ میں بہت سے نادار تھے اور بہت سے مال دار۔ مال دار صحابہ، نادار صحابہ سے کسی طرح بھی روحانیت میں کم نہ تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ کے تمام احکام بجالاتے تھے اور جو دولت ان کے پاس تھی اسے ناداروں، محتاجوں اور جہاد میں خرچ کرتے تھے۔ اگر مال داری روحانیت کے منافی ہوتی تو یہ حضرات ہرگز اسے گھر میں آنے نہ دیتے، کیوں کہ یہ حضرات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ اور ان کے جانشین تھے۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ جیسے صحابہ دولت و ثروت میں ممتاز تھے، تو انفاق فی سبیل اللہ اور غربا پروری میں بھی بے مثال تھے، چنانچہ ان کا روحانی مقام بھی بہت بلند تھا۔

حکومت روحانیت کے منافی نہیں

دولت کی طرح حکومت اور قیادت بھی روحانیت کے منافی نہیں ہے، بشرطیکہ خواہش نفس کی تکمیل کے لیے اور عوام پر اپنی مرضی مسلط کرنے کے لیے نہ کی جائے۔ حکومت اور قیادت کو

دُنیا داری کا کام سمجھا جاتا ہے اور روحانیت کو اس سے دور خیال کیا جاتا ہے، مگر قرآن کی نظر میں حکومت اور روحانیت میں تضاد نہیں ہے۔ اگر حکومت اللہ کے بندوں کے حقوق ادا کرنے کے لیے کی جائے، انصاف اور خیرخواہی کے ساتھ کی جائے اور اللہ کے احکام کو اللہ کی زمین میں نافذ کرنے کے لیے کی جائے تو یہی روحانیت کا تقاضا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝۴۱ (الحج ۲۲:۴۱) ان لوگوں کو جب ہم زمین میں اقتدار عطا کرتے ہیں تو وہ نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں اور بُرائی سے روکتے ہیں اور تمام معاملات کا انجامِ کار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا اور نیکی کی اشاعت کرنا خالص روحانی عمل ہے اور یہ حکمرانوں کی ذمہ داری ہے۔ اگر وہ اس ذمہ داری کو نبھائیں تو مسندِ حکومت پر سرفراز ہونے کے باوجود وہ روحانی ہستیاں ہیں۔ انبیا علیہ السلام سے زیادہ روحانی شخصیت دنیا میں کس کی ہوسکتی ہے۔ غور کیجیے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام اپنے وقت کے عظیم الشان بادشاہ ہیں اور ایسے صاحب شوکت وحشمت کہ چرند پرند اور ہواؤں پر بھی حکومت ہے، مگر اسی کے ساتھ وہ اللہ کے جلیل القدر نبی بھی ہیں اور روحانیت کے امام بھی ہیں۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا مانگی ہے:

رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْــرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ۝۸۰ (بنی اسرائیل ۱۷:۸۰) پروردگار، مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر دنیا میں کوئی روحانی ہستی نہیں پیدا ہوئی، مگر آپؐ کا اقتدار کے لیے دعا کرنا اور پھر مدینہ پہنچ کر اسلامی ریاست قائم کرنا روحانیت کے منافی نہیں ہے بلکہ روحانیت کو مضبوط اور وسیع کرنے کے لیے ہے، تاکہ زمین پر شیطان کی حکومت ختم ہو اور رحمٰن کی حکومت جاری وساری ہو۔ اللہ کے بندوں کے لیے اللہ کی بندگی کا ماحول سازگار ہو، نفسانیت کا

خاتمہ ہو، روحانیت کا بول بالا ہو۔

جناب رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاے راشدین، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ مثالی حکمران تھے۔ دنیا کے تمام حکمرانوں کے لیے اسوہ اور رہنما تھے اور اسی کے ساتھ وہ روحانیت کے اعلیٰ درجے پر فائز تھے۔ آج کی روحانی ہستیوں کا کمال یہ ہے کہ وہ ان خلفاے راشدین کے نقشِ قدم تک پہنچ جائیں اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں جس اعتدال وتوازن کی ضرورت ہے وہ ان پاک ہستیوں سے سیکھیں۔

روحانیت مطلوب ہے رہبانیت نہیں

قرآن نے روحانیت کی جو تعلیم دی ہے وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد، یعنی اللہ اور بندوں کے حقوق کی یکساں ادایگی کے ذریعے انجام پاتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے انسان سماج میں رہ کر دنیا کی ضروریات کی تکمیل کرتے ہوئے اپنی روحانی پاکیزگی کا اہتمام کرے۔ سماج سے کٹ جانا، گوشہ نشینی اختیار کر لینا، لوگوں کی حاجت روائی سے روگردانی کرنا اور انسانی حقوق کی ادایگی سے غفلت برتنا روحانیت کے منافی ہے۔ انسانوں کی فیض رسانی کرنا اور ان کی تکالیف پر صبر کرنا روحانیت کا تقاضا ہے، جب کہ رہبانیت ترکِ دنیا کی تعلیم دیتی ہے، انسانی سماج سے علیحدہ ہوجانے اور گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر یادِ خدا میں زندگی گزارنے کی تلقین کرتی ہے۔ رہبانیت اللہ کو مطلوب نہیں ہے اور اسلام اللہ اور بندوں کے حقوق کی ادایگی کو روحانی زندگی کا مشن قرار دیتا ہے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

> اکثر مذاہب نے دین داری اور خدا پرستی کا کمال یہ سمجھا تھا کہ انسان کسی غار، کھوہ یا جنگل میں بیٹھ جائے اور تمام دُنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لے۔ اسلام نے اس کو عبادت کا صحیح طریقہ نہیں قرار دیا ہے۔ عبادت درحقیقت خدا اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرنے کا نام ہے۔ اس بنا پر وہ شخص جو اپنے تمام ہم جنسوں سے الگ ہو کر ایک گوشے میں بیٹھ جاتا ہے، وہ درحقیقت ابناے جنس کے حقوق سے قاصر رہتا ہے۔ اس لیے وہ کسی تعریف کا مستحق نہیں۔[۷]

ازواج واولاد روحانیت کے منافی نہیں

روحانیت کی راہ عبادت ہے اور عبادت کے لیے انسان یکسوئی چاہتا ہے۔اس یکسوئی کے لیے کبھی وہ تجرد کی زندگی اختیار کر لیتا ہے، یعنی ازواج واولاد کی ذمہ داریوں سے گریز کرتا ہے، اگرچہ تجرد کی زندگی اسلام کی کی نظر میں حرام نہیں ہے مگر مطلوب بھی نہیں ہے۔ انبیا علیہم السلام کی روحانی ہستیاں ازواج واولاد کی حامل تھیں۔ ان انبیاؑ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور رحضرت یحییٰ علیہ السلام نے گو کہ شادی نہیں کی اور ان کے بال بچے نہیں تھے مگر انبیا علیہ السلام کی عظیم اکثریت اُن پر مشتمل تھی جنھوں نے شادی کی اور ازواج واولاد کے حامل ہوئے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شادیاں کیں اور صاحبِ اولاد ہوئے، اس لیے کہ روحانیت کے لیے تجرد کی زندگی مطلوب نہیں ہے بلکہ بال بچوں کی ذمہ داری کے ساتھ روحانی زندگی مطلوب ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو یہ دعا کرنے کی تعلیم دی ہے:

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا۝۷۴ (الفرقان ۲۵:۷۴) اے ہمارے رب ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہم کو پرہیز گاروں کا امام بنا۔

قبر پرستی روحانیت کے منافی ہے

روحانیت کی علامت صرف تقویٰ اور خدا ترسی ہے۔حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی ہے۔ اس کے برعکس آج کے عہد میں روحانیت کے لیے مخصوص علامتیں اور رسمیں وضع کر لی گئی ہیں۔ اس ظاہرداری کا روحانیت سے تعلق نہیں ہے، بلکہ بعض رسمیں روحانیت کے لیے نقصان دہ اور مہلک ہیں۔ان ہی میں ایک رسم بزرگوں اور نیک بندوں کی قبروں کو مزین کرنا، ان پر چراغاں کرنا اور ان کو حاجت روائی کے وسیلے کے طور پر اختیار کرنا اور ان کو مذہبی سرگرمیوں کا مرکز بنانا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں پر جانے اور مُردوں کے لیے دعاے مغفرت کرنے کی تعلیم تو دی ہے مگر قبروں کو سجدہ گاہ بنانے کی ممانعت فرمائی ہے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے:

وَاِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَانُوْا يَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ اَنْبِيَاءِ هِمْ وَصَالِحِيْهِمْ مَسَاجِدًا فَلَا تَتَّخِذُوْا الْقُبُوْرَ مَسَاجِدًا اِنِّيْ اَنْهٰكُمْ عَنْ ذٰلِكَ (الجامع الصحیح مسلم)

تم سے پہلے جو لوگ تھے وہ اپنے نبیوں اور صالحین کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیتے تھے، تم لوگ قبروں کو مسجد نہ بنا لینا۔ میں تم کو اس سے روکتا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض وفات میں اُم المومنین حضرت ام سلمہؓ اور ام حبیبہؓ نے حبشہ کے ایک گرجے کا تذکرہ کیا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر تھی، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان لوگوں کے یہاں جب کسی نیک انسان کا انتقال ہوتا تو اس کی قبر پر مسجد بنا لیتے اور اس میں اس کی تصویر لٹکا دیتے۔ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین مخلوق ہیں قیامت تک۔(الجامع الصحیح مسلم)

قبریں خواہ انبیاؑ کی ہوں یا بزرگوں کی، وہ حاجت روائی کا ذریعہ نہیں ہیں اور نہ عبادت کا مرکز ہیں، بلکہ وہ صرف موت کو یاد کرنے کا مقام ہیں۔ ان کے اسوہ پر چلنے کی ضرورت ہے اور ان کی روحانی تعلیم پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔

مسجدیں روحانیت کا مرکز ہیں

قبروں کے مقابلے میں مسجدیں حاجت روائی کا وسیلہ اور روحانیت کا مرکز ہیں۔ چوں کہ مسجد میں اللہ کی عبادت کی جاتی ہے اور عبادت کے ذریعے اللہ کا تقرب حاصل کیا جاتا ہے، اس سے فریاد کی جاتی ہے، اس سے حاجت روائی کی دعا مانگی جاتی ہے اور خدا اپنے بندوں کی دعا قبول کرتا ہے۔اس لیے روحانیت کا اس سے بہتر اور کوئی مرکز نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْہَا اسْمُہٗ ۙ یُسَبِّحُ لَہٗ فِیْہَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۳۶﴾ (النور ۲۴:۳۶) اللہ کا نور ان گھروں میں پایا جاتا ہے جس میں اپنے نام کا ذکر کرنے اور اسے بلند کرنے کا حکم دیا، ان گھروں میں صبح و شام اس کی تسبیح بیان کی جاتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ سات لوگ جو قیامت کے دن اللہ کے سایے میں ہوں گے ان میں ایک شخص وہ ہے جس کا دل مسجد میں لگا ہوا ہو۔(الجامع الصحیح بخاری)۔ یعنی جس شخص نے مسجد میں پابندی سے نماز ادا کرنے کو وظیفۂ زندگی بنا لیا ہے وہی سایۂ خداوندی کا مستحق ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت اور بندگی روحانیت ہے۔ اللہ کے حکم پر عمل کرنا اور غیر اللہ سے کنارہ کشی کرنا روحانیت کی شاہ کلید ہے۔

حوالہ جات

۱-

۲-

۳-

۵-

۶- سیّد سلیمان ندوی، سیرتِ النبیؐ، دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۱ء، ج۵، ص۱۱

۷- سیرت النبیؐ، ج۵، ص۳۱